Al-Mahdi Research Journal (MRJ)
Vol 5 Issue 5 (July-September 2024)
HJRS HEC Journal Recognition System Category Y
ISSN (Online): 2789-4150
ISSN (Print): 2789-4142

The Past, Present, and Future of Urdu Marsiya: An Analytical Review

اردو مرثیے کا ماضی، حال اور مستقبل: تجزیاتی جائزہ

Muhammad Nazir
Ph. D Scholar, Department of Urdu, University of Karachi,

Zulfiqar Ali
M.Phil Scholar, Department of Urdu, University of Karachi,

Muhammad Hassan
Ph. D Scholar, Department of Urdu, Wafaqi Urdu University Karachi.

Abstract

Marsiya, derived from the Arabic "Ritha," means lamentation over the deceased. In literature, it refers to poetry expressing sorrow and reverence for Imam Hussein's martyrdom at Karbala. Historically, Marsiya had no specific structure, unlike other Urdu poetry forms. Initially, Marsiyas in Dakan (Deccan) were written in individual couplets like Ghazals. Mirza Rafiuddin Suda introduced the Musaddas structure, which became standard. Ashraf Bayabani wrote the first Urdu Marsiya, "Noserhar." Marsiya gained popularity in Dakan due to the Bahmani rulers' appreciation for poetry and Shia Islam. Notable Marsiya poets include Mir Dimir, Mir Khaliq, Mir Babar Ali Anis, Mirza Salamat Ali Dabeer, and Josh Malihabadi. Despite its importance, Urdu Marsiya has received limited attention. This article introduces Marsiya's history, evolution, structure, and prominent poets, highlighting its literary merit and emotional resonance. Marsiya's significance lies in conveying human sorrow and reverence. Its future depends on adapting to new themes and styles. Today, Marsiya continues to evolve, with modern poets exploring new possibilities and themes. Key Features of Marsiya include its elegiac tone, metaphors, and focus on Karbala's events. Urdu Marsiya remains integral to Urdu literature, providing a platform for poets to express emotions and pay tribute to Karbala's martyrs. Some notable modern Marsiya poets include Josh Malihabadi, Najm Aafari, Razm Rudaulvi, Naseem Amrohvi, and others. The article concludes that Urdu Marsiya has a rich history and continues to be an essential part of Urdu literature.

Keywords: Marsiya, Noserhar, Elegy, Ritha, Form, Karbala Events, Martyrdom, Qasida, Metaphors, Allusions, Idioms, Elegiac Tone.

غم واندوہ کا اظہار دراصل عمل تطہیر جسے آسان لفظوں میں تذکیہ نفس کہہ سکتے ہیں۔ پر مسرت مواقع پر خوش ہونا جس طرح انسانی فطرت میں شامل ہے اسی طرح غم واندوہ اور ناگہانی آفت پر آہ بھرنا اور آہ وبکاء کرنا بھی عین فطرت ہے۔ گمان ہوتا ہے دنیائے آفرینش ہی سے انسانوں نے غم اور خوشی کا اظہار کیا ہوگا۔ گویا جتنی انسانی دنیا قدیم ہے، غم اور خوشی کی تاریخ بھی اتنی ہی پرانی ہے۔ اصناف سخن میں غزل، قصیدہ اور مثنوی کی طرح مراثی بھی مقبول ہے۔ اولا تو شاعری ہی اظہار کا ایک بہترین وسیلہ ہے ثانیا جب اظہار کا وسیلہ خطے کی روایت اور مقبول اصناف سے جڑ جائے تو اظہار میں تازگی اور جاذبیت کے ساتھ تاثیر بھی پیدا ہو جاتی ہے لہذا مشرقی شاعری میں غم کا اظہار خواہ ذاتی ہو یا شخصی، قومی ہو یا مذہبی مراثی ہی کی ضامن نظر آتی ہے لفظ مرثیہ خود عربوں کی دین ہے اور عرب میں مرثیہ کے لیے "رثا" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ مختلف محققین نے مرثیہ کی مختلف تعریفیں کی ہیں اسے ملاحظہ کریں۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی مرثیہ کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

> "مرثیہ عربی لفظ "رثا" سے بنا ہے جس کے معنی ہیں مرنے والے کی تعریف و توصیف، گویا مرثیہ ایسی صنفِ شعر ہے جس میں کسی مرنے والے کا ذکر اور اس کی تعریف حسرت اور غم کے انداز میں کی جاتی ہے"۔[1]

عطاء الرحمن نوری مرثیہ کی تعریف یوں لکھتے ہیں کہ:

> "مرثیہ عربی لفظ "رثا" سے مشتق ہے جس کے معنی بکا اور بین کرنے کے ہیں۔ مرثیہ شاعری کی ایسی صنف کو کہا جاتا ہے جس میں کسی کی وفات پر اظہار غم اور مرنے والے کے اوصاف بیان کیے جائیں یعنی مرنے والے کے لیے رونا اور اس کی خوبیاں بیان کرنا مرثیہ کہلاتا ہے۔"[2]

CC BY

شمیم احمد مرثیہ کی تعریف کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

"مرثیہ میں عزیزوں اور بزرگ و برگزیدہ ہستیوں کی موت پر رنج والم کے جذبات سے لبریز جو اشعار کہے جاتے تھے انہیں مرثیہ کہا جاتا تھا۔ اردو میں یہ صنف موضوعات کے لحاظ سے واقعات کربلا سے مختص ہوگئی اور اسی مفہوم میں اس نے اردو شاعری میں خوب ترقی کی۔"[3]

اصناف ادب کا ارتقاء میں سید صفی مرتضی مرثیہ کی تعریف میں یوں گویا ہے کہ:

"مرثیہ عربی لفظ ہے ادب میں اس صنف نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی مرنے والے کے اوصاف و فضائل بیان کیے جائیں واقعہ کربلا سے پہلے بھی عرب کے شاعر اپنے مرنے والوں کے لیے مرثیے لکھتے تھے لیکن واقعہ کربلا کے بعد تمام شعراء کی توجہ اسی ایک واقعہ پر مرکوز ہوگئی کیونکہ یہ دنیا کا عظیم سانحہ تھا اور اس کے بعد سے مرثیہ سے مراد صرف وہ نظم لی جانے لگی جس میں واقعہ کربلا نظم کیا گیا ہو۔"[4]

ڈاکٹر قمر رئیس اور ڈاکٹر خلیق انجم اپنی کتاب اصناف ادب اردو میں مرثیہ کے ضمن میں یوں لکھتے ہیں کہ:

"مرثیہ اردو شاعری میں بیش بہا خزانہ ہے۔ یہ صنف شاعری اردو میں عام طور پر اس نظم کو کہا جاتا ہے جس میں کربلا کے اندوہ ناک واقعات بیان کیے جاتے ہیں۔ حضرت امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کے شہید ہونے کا ماتم کیا جاتا ہے۔"[5]

مرثیہ اصطلاحِ نظم میں اُس صنف کو کہتے ہیں جس میں پیغمبرِ اسلام کے نواسے حضرت امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کی کربلا کے میدان میں المناک شہادت اور ان پر ڈھائے گئے بے پناہ مظالم و مصائب کا بیان کیا جائے۔ اردو صنف سخن کے ذخائر میں مرثیہ کو بڑی اہمیت اور انفرادیت حاصل ہے۔ اردو مرثیہ میں بھی دیگر اصناف سخن کی طرح جس میں غزل کی سادہ بیانی و سوز و گداز، قصیدے کی شان و شوکت کا انداز، رزم بزم کی مرقع کشی، منظر و فطرت نگاری، اور انسانی رشتوں، اور حق و باطل کی جنگ وغیرہ پایا جاتا ہے۔ اہم بات تو یہ ہے کہ یہ اردو کی وہ واحد شاعری کی قسم ہے جس کے لیے شروع میں کوئی خاص ہیئت بھی نہ تھی۔ اس کے مقابل شاعری کے قدیم اور پرانی اصناف غزل، مثنوی اور قصیدہ کے لیے شروع ہی سے ایک خاص مختص ہیئت موجود تھی ۔ لیکن اردو کی مقبول صنف سخن مرثیہ کے لیے کوئی خاص ہیئت شروع شروع میں مقرر نہیں تھے اس وجہ سے شروع کے مرثیہ گو شعراء غزل کے انداز میں مرثیے لکھے جاتے تھے تو کبھی مسدّس، مربّع تو کبھی مخمّس وغیرہ میں اظہار غم کرتے تھے شروع شروع میں ہر شکل میں مرثیے لکھے جاتے تھے لیکن بعد میں مسدّس رائج ہوگئی اور دوسری تمام ہئیتیں متروک ہوگئیں۔ مسدّس میں کل چھ مصرعے ہوتے ہیں شروع کے چار مصرعوں میں بات کی تفصیل بیان کرتے ہیں اور آخری دو مصرعوں میں ایسی دلچسپ یا عجیب بات بیان کی جاتی ہے کہ قاری خود بخود اگلے بند کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اس ضمن میں نسیم انور ہاشمی لکھتے ہیں کہ:

"مرزا رفیع الدین سودا نے سب سے پہلے مرثیہ کو ادبی مقام دیا اور اسے مسدس کی ہیئت بخشی لیکن اسے سنوارنے اور نکھارنے میں فصیح، دلگیر، خلیق اور ضمیر کے ہاتھ تھے اور جب ان ہاتھوں سے گزرتا ہوا مرثیہ انیس تک پہنچا تو یہ زمین آسمانِ سخن بن گئی۔"[6]

مرثیہ دراصل وہ ادبی صنف ہے جو دوسری اصنافِ سخن کی طرح محض فارسی کی نقل نہیں کہی جاسکتی کیونکہ بہترین اور فنّی نقطۂ نظر سے اس کی بہترین شکل کا ارتقاء اردو ہی میں ہوا ہے۔ مرثیہ انسانی جذبات کے فطری اظہار کا اہم ترین ذریعہ ہے کیونکہ دوسرے جذبات کے مقابلے میں غم کا جذبہ زیادہ شدید اور دیرپا ہوتا ہے اس لیے شاعری بھی ایک فطری عمل ہے۔ عموماً مراثی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے شخصی مرثیہ اور کربلائی مرثیہ، اول الذکر مرثیہ کی وہ قسم ہے جو کی شخصیت کی موت پر لکھا جاتا ہے۔ ناقدین نے شخصی کے ساتھ قومی مرثیہ کو بھی مرثیہ کی اقسام میں شامل کیا ہے۔ یعنی قومی رہنما، شخصیت یا عظیم سربراہ مملکت وغیرہ کی وفات پر لکھے جانے والی پر درد شاعری قومی مرثیہ کے ذیل میں آتی ہے۔ بیان موضوع کربلائی مرثیہ ہے اس ذیل میں دلچسپ بات یہ ہے کہ کربلائی مرثیہ میں برصغیر پاک و ہند کی تہذیبی خد و خال کو مکمل طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اسی لیے کربلائی مرثیہ آٹھ اجزاء پر مشتمل ہوں گے۔ کربلائی مرثیہ کو ان آٹھ اجزاء میں تقسیم سب سے پہلے میر ضمیر نے کیے اور انھوں نے خود مرثیے کے یہی نو اجزا قائم کیا۔ گویا ان نو اجزاء میں چہرہ، سراپا، رخصت، آمد، رجز خوانی اور شہادت کے عظیم منظر کو ملاحظہ کرسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تہذیبی سطح پر مرثیہ اس خطے کی خمیر میں شامل ہے اور یہی اس صنف کی مقبولیت کا ذریعہ ہے۔ یعنی کربلائی مرثیہ ایک لحاظ سے نواسہ رسول، جگر گوشہ بتول، جوانان جنت کے سردار حضرت امام حسینؑ اور ان کے باوفا اصحاب و انصار کی سنہ اکسٹھ ہجری میں دی جانے والی عظیم قربانیوں کی یاد کا ذریعہ ہے تو دوسری طرف اسلامی شعار، پیغام کربلا اور مذہبی وحدت کے فروغ کا ضامن بھی ہے۔ ذیل میں کربلائی مرثیہ کے اجزاء مع مثالیں ملاحظہ کریں:

چہرہ

مرثیے کی ابتدا چہرہ کہلاتا ہے۔ چہرے سے مراد تمہید ہے تمہید دلچسپ ہونی چاہیے تاکہ پڑھنے والے اور سننے والے دونوں کی توجہ جلد اس کی طرف مبذول ہوجائے۔ عموماً شاعر مرثیے کی ابتدا منظر نگاری سے کرتا ہے یا کسی تاریخی واقعے کی طرف اشارہ کرتا ہے یا ممدوح کی مدح و توصیف بیان کرتا ہے بعض اوقات وہ تعلّی سے کام لیتا ہے مرثیہ نگار چہرہ پُرکشش انداز میں پیش کرتا ہے۔ بطور نمونہ مرثیہ سے یہ بند ملاحظہ کریں:

"یا رب چمن نظم کو گلزار ارم کر
اے ابر کرم خشک زرعت پہ کرم کر
تو فیض کا مبدا ہے توجہ کوئی دم کر
گمنام کو اعجاز بیانوں میں رقم کر
جب تک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے
اقلیم سخن میرے قلم رو سے نہ جائے"[7]

سراپا

ہیرو کے سراپا کی تصویر کشی نہایت مشکل مرحلہ ہے۔ ہیرو کے حسن و جمال کی تعریف کے ساتھ ساتھ اس کے ذاتی محاسن کا تذکرہ ہوتا کہ اس کی قربانی، وفاداری، ہمّت اور جرائت کی خصوصیات بھی نمایاں ہوجائیں۔ اس سلسلے میں شاعر تشبیہات و استعارات کا سہارا لیتے ہیں تاکہ وہ اپنے مقصد میں کامیابی سے ہمکنار ہوسکے۔ مثلاً

"قربان شان شوکت و اجلال و رعب و داب
دامَن علم کا رحمتِ معبود کا سحاب
پنجہ وہ جس کے رشک سے چھپ کر بصد حجاب
خورشید دن کا چاند قمر شب کا آفتاب

CC BY

یہ گرمی جلال یہ موسم شباب کا
ہے سر پہ دو پہر کو مقام آفتاب کا"[8]

رخصت

رخصت کا منظر بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے اگر اسے تفصیل سے اور پُر تاثیر الفاظ میں بیان کیا جائے تو سامعین اور قارئین کے جذبات کو برانگیختہ کیا جا سکتا ہے۔ رخصت کا منظر نہایت روح فرسا ہوتا ہے لیکن اگر شہادت کی سعادت کو پیشِ نظر رکھا جائے تو قلب کو سکون حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً

"خواہر تمہیں خدا و پیمبر کا واسطہ
خواہر تمہیں جوانیِ اکبرؑ کا واسطہ
ہمشیر تم کو حیدرِ صفدر کا واسطہ
رخصت کر و بہن علی اصغرؑ کا واسطہ
کچھ اس میں شک نہیں یہ مقامِ بُکا تو ہے
گو ہم نہیں ہیں سر پہ تمھارے خدا تو ہے"[9]

آمد

رخصت کے بعد آمد شروع ہوتی ہے۔ ہر مجاہدِ حسینؑ نہایت ہی شان و شوکت سے میدانِ کارزار میں وارد ہوتا ہے اس سے اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ وہ حق پر ہے اور اللہ کی مرضی پر عمل پیرا ہے اور دینِ اسلام کی بقا کی خاطر وہ جہاد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے۔ مثلاً

"کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے
رن ایک طرف چرخِ کہن کانپ رہا ہے
رستم کا بدن زیرِ کفن کانپ رہا ہے
ہر قصرِ سلاطین زمن کانپ رہا ہے
شمشیر بکف دیکھ کے حیدر کے پسر کو
جبریل لرزتے ہیں سمیٹے ہوئے پر کو"[10]

رَجز

رَجز عرب کے قدیم دستور کی طرف اشارہ ہے۔ عربوں کو اپنے حَسَب و نَسَب پر بہت ناز تھا جب مخالف پہلوان ایک دوسرے کے مدِ مقابل ہوتے تو اپنے اپنے اسلاف کے کارنامے فخریہ انداز میں بیان کرتے تھے اور اس کے بعد معرکہ آرا ہوتے اور اپنی شجاعت کے جوہر دکھاتے تھے چنانچہ رَجز بھی مرثیے کا ایک اہم جزو بن گیا ہے۔ مثلاً

"ماتھے کا عرق پاک کیا انگلی سے بارے
سورج سے کیے دور مہ نو نے ستارے
حیدر کے لب و لہجے میں لشکر کو پکارے
ہاں غافلو آگاہ رہو رتبے سے ہمارے
اللہ کے بندے ہیں پہ اللہ نہیں
بندے مگر اس طرح کے واللہ نہیں"[11]

جنگ

رجز کے بعد جنگ کی باری آتی ہے تو ہر انصارِ حسینی اپنے عزیز اقارب اور سپہ سالار سے رخصت طلب کرنے کے بعد میدانِ کارزار میں وارد ہوتا ہے اور مخالف پہلوان کے آمنے سامنے ہو کر اپنے حَسَب و نَسَب بیان کرتا ہے اور اس کے بعد جنگ شروع ہوتی ہے۔ بعض دکنی مرثیہ نگاروں کے کلام میں رزم کے ابتدائی نمونے ملتے ہیں۔ مثلاً

"یہ کہہ کے جُھکا اکبرِ مظلوم پہ لشکر
تب مستعدِ جنگ ہوا اُن سے وہ دلبر
چلاّ کے یہ تب کہنے لگے شاہ سے اکبرؑ
اماں سے کہو دیکھیں مری تیغ کے جوہر
تلوار پکڑ اور سپر کھول کے اکبرؑ
بس جا ہی پڑا بیچ میں اس غول کے اکبرؑ"[12]

شہادت

شہادت کا بیان مرثیے کا اہم جزو تسلیم کیا جاتا ہے۔ مرثیے میں عموماً کربلا کے کسی مجاہد کی شہادت کا تذکرہ ہوتا ہے۔ محبت و عقیدت کے جذبے سے سرشار ہو کر وہ موت کو خوش آمدید کہتا ہے۔ مثلاً

"کبھی یہ طور نہ تھا اے مرے فرزند فہیم
زینبؑ آئی ہوں ترے پاس نہ کی ہو تعظیم
گرد لاشے کے پڑی پھرتی ہیں باحالِ سقیم
آج کیوں بھول گئے اپنا وہ معمولِ قدیم

CC BY

اٹھو اور عمِّہ ناشاد کی تعظیم کرو
جنگ کے وصف بیاں کرتی ہیں تعظیم کرو"[13]

بین

بین غم و فرقت کی ایسی کیفیت ہے جس کے ذریعے مرنے والے کے عزیز و اقارب اس کی غم میں گریہ وزاری کرتے ہیں اور گریہ وزاری کا یہ عمل ان کے غم کو ہلکا کر دیتا ہے۔

"بھیا مرا کوئی نہیں تم خوب ہو آگاہ
احمد ہیں، نہ زہرا، نہ حسن ہیں نہ یداللہ
ڈھارس تھی بڑی آپ کی، اے سیدذی جاہ
چھوڑا مجھے جنگل میں یہ کیا قہر کیا آہ
چلتے ہوئے کچھ مجھ سے نہ فرما گئے بھائی
بہنا کو نجف تک بھی نہ پہنچا گئے بھائی"[14]

اردو مرثیے کی روایت

مرثیہ اردو شاعری میں ایک بیش بہا خزانہ ہے اور صنف سخن مرثیہ نے اردو شاعری کی اہمیت میں اضافہ کیا ہے۔ اردو ادب میں مرثیہ نگاری کا باقاعدہ آغاز پندرھویں صدی میں دکن سے ہوا اور دکن کے صوفیائے کرام کی سرپرستی اور رہنمائی سے اردو مرثیہ نے فروغ پایا۔ اردو کا پہلا مرثیہ گو شاعر ہونے کا اعزاز اشرف بیابانی کو حاصل ہیں آپ نے نوسرہار (1503) میں لکھ کر اردو مرثیہ گوئی کا باقاعدہ آغاز کیا۔ اس کے بعد شاہ برہان الدین جانم اور شاہ راجو نے بھی مرثیے لکھے۔ دکن میں شاعری اور مرثیہ نگاری کو فروغ ملنے کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی تھی کہ یہاں کے شہنشاہ و نواب نہ صرف شاعروں کے قدر دان تھے بلکہ خود مذہبی آدمی ہونے کی وجہ سے مرثیہ وغیرہ خوب کہتے تھے مگر مرثیہ اس زمانے میں بالکل ابتدائی حالت میں تھا۔ دکن میں مرثیہ نگاری کو زیادہ سے زیادہ فروغ ملنے کی بنیادی وجہ یہاں کے حکمران تھے کیونکہ دکن کے اکثر حکمران شاعر تھے اور اہل بیت کے شان میں مدح سرائی کرتے تھے اس وجہ سے یہاں شاعری کے ساتھ ساتھ مرثیہ نگاری کو فروغ ملا۔

اس ضمن میں نامور محقق ام ہانی اشرف لکھتے ہیں کہ:

> "اردو میں مرثیے کا آغاز دکن سے ہوا۔ بہمنی فرماں رواں شیعیت کی جانب مائل تھے۔ اس وجہ سے دکن میں حضرت امام حسینؑ کو خراج عقیدت پیش کرنے کا رجحان طبقہ شعراء میں بڑھتا چلا گیا۔ ایرانی علما کی آمد نے بھی اس رجحان کو فروغ بخشا۔ عشرہ محرم میں باقاعدہ اہتمام ہونے لگا۔ قطب شاہی دور میں مرثیہ گوئی کو مزید تقویت ملی۔ اس خاندان کا پانچواں حکمراں اور اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ بذات خود مرثیہ گو تھا۔ وہ عشرہ محرم کی مجلسوں میں شریک ہوتا، اشعار سنتا، خود بھی سناتا۔"[15]

اردو میں جب سے ہمارے شاعروں نے پر و بال سنبھالے اور دیوان مرتب کرنا شروع کیے اس وقت سے مرثیوں کے نمونے دستیاب ہونے لگے ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ اور ولیؔ دکنی کے دیوان و کلیات سے بہادر شاہ ظفرؔ و غالبؔ تک اردو میں مرثیے کا ذخیرہ قابلِ قدر اور دقیق ہو چکا تھا، مرثیے کا موضوع کربلا کے خونیں واقعات ہیں۔ شاعروں نے ابتدا میں غزل کے انداز میں شہدا کے حضور میں عقیدت کے آنسو پیش کیے ہیں ان مرثیوں کے ہر شعر کا عموماً دوسرے شعر سے رابطہ نہ ہوتا تھا۔ جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ اردو میں مرثیے کا سراغ دکنی شعرا کے ہاں اُسے ملتا ہے بعد کے دور میں بھی بیسوں شاعروں نے مرثیے لکھے ان میں آبرو، میر ضاحک، سودا، میر، مصحفی، نظیر اکبر آبادی، قائم چاندپوری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ سودا نے مرثیہ نگاری کی صورت و معانی میں بہت سے اضافے کیے، مرثیے کا ادبی لہجہ سنوارا اور اسے ادبی وقار بخشا۔ سوداؔ کے بعد میر، قائم، مصحفی اور میر حسن نے بھی اچھے مرثیے کہے۔ غالبؔ نے زین العابدین خان عارف کا دردانگیز مرثیہ لکھا۔ شاہانِ اودھ کے دور میں شیعیت کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ لکھنؤ میں شیعوں کی مخصوص رسوم اور عزاداری کے ساتھ مرثیہ گوئی کا رواج قدرتی تھا اُس دور میں یوں تو بے شمار شعراء نے مرثیے لکھے مگر اوّل خلیق، ضمیر اور دلگیر و فصیح نے اور پھر انیس و دبیر نے مرثیے کو انتہائی عروج و کمال تک پہنچا دیا۔ خلیق کی زبان فصیح و سادہ ہے۔ میر ضمیر نے مرثیے کی صورت میں تبدیلیاں کر کے اسے زیادہ دلچسپ بنایا۔ ضمیر نے مرثیے کی ظاہری شکل متعین کر دی تھی اور اسے لکھنو کی نئی فضا کے مطابق بنا دیا تھا۔ ضمیر نے دو مثنویاں بھی لکھی ہیں ایک کا نام "مظہر العجائب" اور دوسرے کا نام "ریحانِ معراج" ہے ان مثنویوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ضمیر کے ذہن میں نوحہ و سلام کی تکنیک سے بڑا خاکہ بھی تھا، ان کے اس تجربے سے مرثیہ میں چہرہ، سراپا، رزم اور بزم کی بعض جدّتوں نے راہ پائی۔ ضمیر کی شعری لطافتوں کو ان کے شاگرد مرزا سلامت علی دبیر نے اپنایا اور اسے اپنی قابلیت سے چار چاند لگائے۔ مرزا دبیر نے مرثیے کو خاص علمی تحفہ بنا دیا۔ عربی فارسی ترکیبیں، تشبیہ، استعارہ اور دوسری ادبی خوبیاں ان کے مرثیوں میں اس طرح نظر آتی ہیں جیسے سونے پر جڑواں نگینے۔

مرثیے کی دوسری روایت خلیق سے انیس تک پہنچی۔ خلیق واقعات اور روایات نظم کرنے میں ماہر اور اپنے پیش رو مرثیہ گویوں کے متبع ہیں۔ خلیق کی زباں میں چاشنی، بیاں میں درد، کلام میں اثر ہے ان کے بیٹے انیس مدتوں اسی رنگ میں مرثیے لکھتے رہے۔ انیس نے مرثیے کو ایسے نقطۂ عروج تک پہنچا دیا کہ آج تک کوئی مرثیہ نگار ان کے مدِ مقابل نہ ہو سکا۔ میر ببر علی انیس کے اسلوب کے حوالے سے معروف محقق و مورخ رام بابو سکسنہ لکھتے ہیں کہ:

> "میر انیس تمثیلوں استعاروں اور صنائع بدائع میں کمال رکھتے ہیں وہ فضول مبالغے اور بیجا اغراق کو ہرگز پسند نہیں کرتے جن کی اس زمانہ میں کثرت تھی۔ صنائع بدائع کا استعمال اس خوبی سے کرتے ہیں کہ جس سے شعر پر کوئی بار نہیں پڑتا اور حسن بڑھ جاتا ہے۔"[16]

دکن میں مرثیہ نگاری

دکن کے شعراء نے جتنا مرثیے پر زور دیا ہے اتنا نظم کی کسی اور صنف کو اپنے خیالات کا مرکز نہیں بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں اردو کے ابتدائی دور میں دکن کے ایسے شعراء نظر آتے ہیں جن کا سارا سرمائیہ کلام نوحہ بین، ماتم، سلام اور مرثیے تک محدود ہے۔ دکن میں اس فن کو محض اس وجہ سے قبولِ عام تھا کہ ایّامِ عزا میں گھر گھر مجالس انعقاد پذیر ہوتی تھیں اور ان میں مرثیے، سلام اور نوحے پڑھے جاتے تھے یہی وجہ ہے کہ اُس دور کی اس صنف میں وہ جذبہ پوری شدّت اور کیفیت کے ساتھ ملتا ہے جو رونے اور رلانے کے لیے ناگزیر ہے۔ دکن مین سولھویں صدی عیسوی تک جو مرثیے لکھے گئے وہ دکنی اردو میں تھے۔ دکن کے ابتدائی مرثیوں میں عقیدت مندانہ جذبات اور سادگی کو بڑا دخل رہا ہے۔ دکن کے شعرا کے مرثیے اپنی خصوصیات کے لحاظ سے اہم بھی ہیں اور منفرد بھی، ان مرثیوں میں مرثیہ کی تمام خوبیاں نمایاں ہیں۔ انسانی جذبات کے ساتھ انسانی سیرت کا پہلو بھی خوب صورت طریقے سے بیان کیا ہے اس کے علاوہ ان کے مرثیوں میں مقامی تہذیب و ثقافت کا اثر بھی نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

CC BY

دہلی میں مرثیہ گوئی:

دہلی مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کا ایک اہم مرکز رہا ہے۔ دہلی مرثیہ صرف اس لیے عام نہیں ہے کہ دہلوی مرثیہ کا رہبر و پیش رو ہے بلکہ اس لیے بھی اہم ہے کہ یہ اردو مرثیہ گوئی کی تاریخ کی سب سے اہم کڑی ہے۔ دہلی کی اردو مرثیہ گوئی اورنگ زیب کے آخری زمانے سے شروع ہو کر فرخ سیّر اور محمد شاہ کے زمانے میں اپنے ابتدائی عروج کو پہنچ چکی تھی۔ عزاداری کا زور و شور ، مرثیہ خوانوں کی کثرت، شاعروں اور شہزادوں کی مرثیہ خوانی سب اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ دہلی مرثیہ گوئی کا اہم مرکز تھا۔ مرثیہ گوئی کے ساتھ سلوک اور پذیرائی بھی عام تھی۔ بہر حال یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ دکن میں صنفِ مرثیہ میں جو جوش و خروش تھا وہ دہلی میں نظر نہیں آتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ گولکنڈہ اور بیجاپور کے بادشاہ شیعہ تھے اور ان میں سے بعض خود شاعر تھے اور مرثیہ لکھتے تھے۔ دلی میں بھی بہت سے مرثیہ گو شاعر پیدا ہوئے ان میں سب سے پہلے فضلی ہیں۔ فضلی کی "کربل کتھا یا دہ مجلس" کی اشاعت کے بعد محمد شاہ بادشاہ کو دِلی میں دربار خانقاہ اور عوام سبھی سے سہارا دے دیا۔

اس ضمن میں اردو مرثیے کا ارتقاء کے مصنف لکھتے ہیں کہ:

> "فضل علی فضلی نے کربل کتھا 1752ء میں لکھی۔ اس میں بارہ مجلسیں ہیں جو فارسی کی مشہور و مقبول کتاب روضتہ الشہدا کو سامنے رکھ کر آسان اردو میں لکھی گئی ہیں تا کہ جو لوگ مجلسوں میں فارسی نہ جاننے کی وجہ سے روضتہ الشہدا کو سمجھ نہیں سکتے وہ بھی کربل کتھا کی صورت میں اسے سن کر واقعات شہادت سے اثر لے سکیں۔ اس سے یہ بات صاف طور پر معلوم ہوتی ہے کہ اس وقت مجلسوں میں عموماً روضتہ الشہدا کے پڑھنے کا رواج جسے روضتہ خوانی کہتے ہیں۔"[17]

روضتہ الشہدا ایک ضخیم تصنیف تھی اور اس کے کچھ ابواب اتنے طویل تھے کی ایک مجلس میں پڑھنا اور سنانا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہو رہا تھا اس وجہ سے سامعین کی سہل پسندی کے لیے فضل علی فضلی نے اس کا اختصار کے ساتھ اس کا خلاصہ آسان اردو میں کربل کتھا کے نام سے ترجمہ کر کے سامعین کے ایک مشکل مسلے کو آسان کر دیا۔

لکھنؤ میں مرثیے میں مرثیہ نگاری

لکھنؤ ہمیشہ سے شیعیت کا مرکز رہا ہے اور اہل تشیع شہدائے کربلا کا دل سے ادب اور احترام کرتے ہیں۔ اس شہر میں عشرۂ محرم بڑی عقیدت کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ یہاں کے بادشاہوں نے بڑی بڑی عمارتیں بنوائیں جہاں ایّامِ عزا میں مومنین جمع ہوتے اور شہدائے کربلا کے مجالس نہایت عقیدت و احترام سے منعقد کرتے تھے۔ امیر سے لے کر غریب تک اس مہینے کو متبرک سمجھ کر جملہ مراسم، عزاداری اس میں انجام دیتے تھے۔ اظہارِ غم کا سب سے مؤثر طریقہ مرثیہ خوانی ہے۔ مرثیہ لکھنا اور مرثیہ پڑھنا ہمیشہ سے ایک مذہبی کام سمجھا جاتا رہا ہے۔ شیعہ حضرات اسے اپنی بڑی خوش نصیبی سمجھتے ہیں۔ اگر ایک بند بھی امامِ مظلوم کی شان میں یا ایک شعر امیر کی تعریف میں حصول ثواب کی نیت سے وہ کہہ دیتے تھے تو یہاں کے بادشاہ ایسے لوگوں کی قدر دانی اس قدر کرتے تھے کہ لوگ ان کو باذہب خیال کرتے تھے اور یہاں تک کہ وہ سال بھر دنیاوی عیش و عشرت میں مبتلا رہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ایک مہینے کی عزاداری سال بھر کی گناہوں کا کفّارہ ہو جائے گی مگر علماء اور شعراء مرثیے کی قدر دوسری نظر سے کرتے تھے اور اسے ایک ادبی کام سمجھتے تھے۔

لکھنؤ میں مرثیے کی ترقی جن شعراء کی بدولت ہوئی ان میں مرزا دلگیرؔ کا نام اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ وہ ہندو مرثیہ گو ہے۔ مثلاً دلگیر نے اپنے ایک مرثیے میں رخصت کے منظر کو یوں بیان کیا ہے:

بانو سے اجازت کو جب آیا علی اکبرؑ
روتا ہوا رخصت طلب آیا علی اکبرؑ
یہ کہتا ہوا ماں سے تب آیا علی اکبرؑ
ہے آپ سے رخصت کو اب آیا علی اکبرؑ

اس حوالے سے اردو کے معروف محقق عبدالروف عروج یوں لکھتے ہیں کہ:

> "مرزا دلگیر کی زبان اور طرز ادا کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ خاندانی ہندو ہونے کے باوجود بین، شہادت اور رخصت کے بیان میں اس کثرت سے مسلمانوں کے مراسم کا ذکر کرتے ہیں کہ ان کے ہندو ہونے پر شبہ ہونے لگتا ہے۔ مرزا دلگیر کے مرثیوں کا اعتبار ان کی اپنی انفرادیت میں مضمر ہے۔ اس دور میں جب کہ لکھنو مرثیہ گو باکمالوں کا مرجع بن گیا تھا۔ نہ اپنی ادبی حیثیت کو منوالینا کوئی آسان کام نہیں تھا یہی وجہ ہے کہ مرزا دلگیر نے عام روش سے ہٹ کر اپنے مراثی میں ایسے مضامین اور گوشے سے پیدا کیے ہیں۔ ان کے استاد ہونے میں کسی قسم کا کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔"[18]

دلگیر، میر خلیق، مرزا فصیح اور مرزا ضمیر کے دور کا ہے۔ یہ چاروں کلاسیکی مرثیے کے اُس دور کے عناصرِ اربعہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ میر انیس اور مرزا دبیر کا دور مرثیے کا سنہری دور تھا۔ مرثیے کو جو عروج و کمال اُس دور میں نصیب ہوا وہ نہ اس سے پہلے ہوا اور نہ اس کے بعد۔ اُس دور میں مرثیے کی ترقی رُک گئی کیونکہ انیس و دبیر کے بعد میدانِ مرثیہ گوئی میں شعراء کے لیے اپنے کمالاتِ فن دکھانے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔

بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں سیاسی، سماجی اور معاشی صورت حال نے اردو مرثیے کی ہیئت پر زیادہ اثر نہیں ڈالا مگر موضوعات اور مواد کے اعتبار سے اُس دور میں جو تبدیلیاں سامنے آئیں خاص طور پر امام حسینؑ کی شہادت کے بعد کے حالات، واقعات کو خصوصیت سے مرثیے کا موضوع بنایا گیا اور پیغامِ امام کی تشہیر اس کا بنیادی مقصد سمجھا جانے لگا اس سلسلے میں آلِ رضا، نجم آفندی، جمیل مظہری، نسیم امروہوی، علی سردار جعفری اور جوش ملیح آبادی نے جس طرح مرثیے کو اس عہدِ حاضر کے عصری تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

جدید دور کے مرثیہ نگاروں میں قیصر بارہوی، شاہد نقوی، صبا اکبر آبادی، سیف زلفی، افسر عباس زیدی، ڈاکٹر ہلال نقوی، کے مرثیوں کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان شعراء نے نہ صرف فنّی اعتبار سے بلکہ فکری حوالے سے بھی مرثیے کو جدید دور کے ساتھ منسلک کر دیا ہے۔ عصرِ حاضر میں مرثیے کی صنف کو مقبول بنانے والوں میں شاہد نقوی کا نام بھی پیش پیش ہے۔ آلِ رضا اور جوش جدید مرثیے کے بڑے نقیب ہیں اور شاہد نقوی اسی جدیدیت کے علمبردار ہیں۔ دورِ حاضر کے اچھے مرثیہ نگاروں میں ایک اہم نام ید اللہ حیدر کا بھی ہیں آپ شہر قائد کے اچھے مرثیہ گو شاعر ہیں۔ آپ اپنے خاندانی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے مرثیہ لکھ رہے ہیں اور مراثی کے مجموعے بھی شائع کر چکے ہیں۔ شہر قائد اور برصغیر کے نامی گرامی معروف عالم دین، مفسر قرآن علامہ طالب جوہری (مرحوم) نے بھی عمدہ مرثیہ تخلیق کیے ہیں اور حرف نمو کے نام سے مراثی کا ایک مجموعہ بھی شائع ہوا ہے۔ اسی طرح غزل گوئی کے اچھے شاعر اختر عثمان بھی عمدہ مرثیہ لکھ رہے ہیں۔[19]

مرثیہ نگاری کا تعلق صرف لکھنے کے حد تک نہیں ہے بلکہ مرثیہ نگار اسے تخلیق کرنے کے بعد مجالس حسین میں پڑھ کر اپنی عقیدت کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ مجالس حسینؑ میں جس طرح سے میر انیس، مرزا دبیر نے مرثیہ پڑھا اور قارئین سے خوب داد وصول کیے اس سے مرثیہ کی اہمیت و مقبولیت میں بہت زیادہ اضافہ ہوا۔ مجالس حسینؑ میں مراثی تحت اللفظ پڑھنے کی روایت پرانی

CC BY

ہے۔ خصوصا کراچی، لاہور، ہندوستان کے لکھنو میں اہل زبان مرثیے اور سوز و سلام کا خصوصی اہتمام کرتے آرہے ہیں۔ جہاں تک مستقبل کا تعلق ہے دیگر اصناف کی نسبت مرثیے کی مقبولیت میں کمی آئی ہے آنے والے وقتوں میں اس صنف سے زیادہ سلام لکھنے اور پڑھنے کا رواج عام ہو گا۔ اس میں براہ راست عمل دخل سامعین اور ڈیجٹل دور کا بھی ہے کیونکہ لوگ سہل پسند ہو گئے ہیں لہذا مراثی کے سو، دو سو بند سننے کی نسبت سلام کے چھ، سات اشعار پر اکتفا کرتے ہیں دوسری وجہ وہ جنریشن گیپ بھی ہے اور نئی نسل مجلسی ادب سے دور بھاگتے ہیں اس وجہ سے صدیوں پرانی روایت معدومیت کا شکار ہے۔

حواشی

1. ہاشمی، رفیع الدین، ڈاکٹر، اصنافِ ادب (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 1991)، ص50۔
2. عطاالرحمن نوری، اردو اصناف ادب، (رحمان پبلی کیشنز، 2016، ص14۔
3. شمیم احمد، اصناف سخن اور شعری ہیئتیں،، بھوپال: انڈیا بک امو ریم، 1981، ص82۔
4. مرتضی، صفی، سید، اصناف ادب کا ارتقاء، (لکھنو: نسیم بک ڈپو، سن اشاعت ندارد)، ص29۔
5. انجم، خلیق، ڈاکٹر، اصناف ادب اردو، (علی گڑھ: سرسید بک ڈپو، 1995)، ص37۔
6. ہاشمی، نسیم، انور، میزان تنقید (کراچی: بک سینٹر، 1995)، ص111۔
7. سراج، مسعود، اومکار کول، اردو اصناف نظم ونثر کی تدریس، (نئی دہلی: قومی کونسل اردو بازار، 2003)، ص88۔
8. صفدر آہ، علمدارِ کربلا، (ممبئی: کتاب کدہ، 1960)، ص30۔
9. جعفری، سید قمقام، ڈاکٹر، شاگردانِ انیس، (کراچی: مکتبہ جعفریہ نارتھ ناظم آباد 1979)، ص386۔
10. حیدری، اکبر، ڈاکٹر، انتخاب مراثی مرزا دبیر، (لکھنو: اتر پردیش اکادمی، 1979)، ص301۔
11. عابدی، تقی، سید، انتخاب مراثی دبیر، (دہلی، ساہتیہ اکادمی، 2013)، ص79۔
12. آبادی، عظیم، شاہ، پیمبران سخن، (لاہور: بارگاہِ ادب 1974)، ص43۔
13. حیدری، اکبر، ڈاکٹر، اودھ میں اُردو مرثیے کا ارتقاء، (لکھنو، نظامی پریس 1981)، ص488۔
14. سراج، مسعود، اومکار کول، اردو اصناف نظم ونثر کی تدریس، (نئی دہلی: قومی کونسل اردو بازار، 2003)، ص92۔
15. اشرف، ہانی، ام، اردو مرثیہ نگاری، (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، 1992)، ص9۔
16. سکسینہ، بابو، رام، تاریخ ادب اردو (پاکستان: غضنفر اکیڈمی، 1995)، ص246۔
17 زمان، مسیح، اردو مرثیے کا ارتقا، (لکھنو: نگر دین دیال روڈ، 1968)، ص52۔
17. عروج، عبدالرؤف، اُردو مرثیے کے پانچ سو سال، (کراچی، ماہنامہ راہی 1961)، ص34۔
18. نقوی، ضمیر اختر، علامہ، اردو مرثیہ پاکستان میں، (کراچی: مرکز علوم اسلامیہ، 1982)، ص106۔

CC BY